© rasailojaraid.com

عہد زوال اور مثنوی سحرالبیان

خالد اقبال یاسر

چیف ایڈیٹر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

میر حسن (۱۷۲۸ء۔ ۱۷۸۷ء) نے ایسے پر آشوب دور میں آنکھ کھولی جب مغل سلطنت اپنے عروج کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی اور اب اس زریں عہد کی یادیں اور یادگاریں باقی رہ گئی تھیں۔ دربار، عوام اور فوج کے رشتوں پر استوار سماجی ڈھانچہ شکست وریخت کے اندوہناک عمل سے دوچار تھا اور اس دور کے ہر صاحب بصیرت انسان کی طرح میر حسن بھی اس زوال کے حساس مگر بے بس عینی شاہد تھے ان کے اپنے بیان کے مطابق "شروع جوانی میں گردش روزگار بدہنجار کی جفا کاری سے وہ لکھنؤ اور فیض آباد کی طرف روانہ ہوئے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۷۳۹ء میں دہلی پر نادر شاہ کی یلغار، قتل عام، لوٹ مار اور غارت گری سے ان کا براہ راست سابقہ پڑا ہوگا اور شاید یہی ان کے خاندان کی دلی سے ہجرت کی بنیادی وجہ ہوگی۔ فیض آباد اس وقت تک دلی کی بہ نسبت پر امن مقام تھا اگرچہ ان کے ذاتی حالات یہاں بھی دگرگوں ہی رہے۔ انہی ذاتی پریشانیوں، عسرت اور تنگدستی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اجتماعی کسمپرسی اور محرومی کا اظہار ان کی مثنوی "سحرالبیان" میں ہوا ہے جس کو ہمارے درسی ناقدین عام طور پر زبان و بیان کی دل کشی، منظر کشی پر قدرت، واقعہ نگاری کے تسلسل اور جزئیات پر کامل گرفت جیسی خصوصیات کے لئے اہمیت دیتے رہے ہیں۔

اٹھارویں صدی کی آخری دہائیوں میں جس وقت یہ مثنوی تخلیق ہوئی مرکز کی گرفت صوبوں پر اس حد تک کمزور پڑ چکی تھی کہ مغل شہنشاہ شاہ عالم صرف نام کا شاہ عالم رہ گیا تھا۔ نادر شاہ کے بعد ملک احمد شاہ ابدالی، مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کی لوٹ مار کی زد میں تھا۔ کمزور بادشاہ رعایا کی حفاظت کے قابل نہ رہا تھا۔ اس کی فوج سازشوں کا شکار ہو کر منتشر ہو چکی تھی۔ سودا کے الفاظ میں شہنشاہ دہلی کی فوج کے۔

جو پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے

عماد الملک کی ریشہ دوانیوں اور مرہٹوں کے ساتھ ملی بھگت نے بادشاہ کو بالکل کنگال کر کے رکھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ذاتی ملازمین اور محل کے محافظین کو بھی تنخواہ دینے سے قاصر تھا۔ اس وقت عوام میں ایک فقرہ زبان زد خاص و عام تھا۔

سلطنت شاہ عالم، از دلی تا پالم

خالصہ کی زمینوں کے مزارعوں تک نے لگان دینے سے انکار کر دیا تھا، نوبت یہاں تک آن پہنچی تھی کہ شہزادیوں اور بیگمات کے کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے تھے۔ بادشاہ کی پالکی کے لئے کہار نہ ملتا تھا۔ ۱۷۵۴ء کے قریب محل کے ملازموں اور محافظوں کی چھتیس مہینوں کی تنخواہیں بقایا تھیں۔ چنانچہ وہ خود کو بادشاہ کی ملازمت سے آزاد سمجھتے تھے انہوں نے کئی بار بغاوت کی اور امراء و وزراء خاص طور پر میر منشیوں کی حویلیوں پر خوراک کے حصول کے لئے حملے کئے۔ ۱۷۵۶ء میں جب ایک وزیر کا انتقال ہوا تو انہوں نے نقد معاوضہ وصول کئے بغیر اسے دفنانے سے انکار کر دیا۔ اسی سال انہوں نے قلعہ کی ناکہ بندی کر دی اور اپنے مطالبات پورے ہونے تک خوراک اور پانی تک قلعے کے اندر نہ جانے دیا۔ وزیروں نے انہیں کھلے عام لوٹ مار کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس لئے کہ وہ خود ان کے تقاضے پورے کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ کوتوال شہر تک ڈاکہ زنی کی وارداتوں میں ملوث تھے اور لوٹ کے مال میں سے اپنا حصہ وصول کر کے ان کے خلاف کارروائی نہ کرنے کی ضمانت دیتے تھے۔

اس زوال کا ادب پر براہ راست اثر یہ ہوا کہ فارسی جو پہلے دربار کی زبان تھی اور علم و فضل کا معیار سمجھی جاتی تھی اس کا غلبہ کمزور پڑ گیا اور شعراء نے اردو زبان کو اظہار کا ذریعہ ٹھہرایا۔ لیکن شعراء اب بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے ملازمین کی طرح کسی حد تک امراء کی سرپرستی کے محتاج تھے اور دلی کے امراء کی زبوں حالی نے شعراء کو لکھنؤ کی جانب ہجرت پر اس لئے مجبور کیا کہ ابھی وہاں کے امراء مکمل طور پر بد حال نہیں ہوئے تھے ' لیکن زوال کا اثر بہرحال بے حد ہمہ گیر اور اجتماعی ہوتا ہے۔ فعال دور گزر چکا تھا۔ امراء کے پاس فراغت ہی فراغت تھی۔ نہ تو انہیں جنگ کی ضرورت ہی رہی تھی اور نہ ہی انہیں اس میں کوئی فائدہ نظر آتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ زوال کے عمل سے ذہنی طور پر خاموش سمجھوتہ کر چکے ہوں۔ ارادے کمزور سے کمزور تر اور وسائل محدود سے محدود تر ہوتے جا رہے تھے۔ جی حضوری ' سازندے اور دستار پوش ملا دربار پر چھائے ہوئے تھے۔ امراء خاصان حرم کے درمیان داد عیش دینے میں مشغول رہتے تاکہ خارجی دنیا کے تلخ حقائق اور افق سے اٹھتی آندھیوں کے آثار انہیں پریشان نہ کریں۔ شاعر بھی اسی دربار کا ایک حصہ تھا لیکن ایک ہی ماحول اور ایک جیسے زمانے میں رہتے ہوئے بھی شعراء کا رد عمل جدا جدا رہا۔

ان میں سے ایک رویہ حقیقت پسندی اور زوال کا مقابلہ کرنے کی انفرادی جدوجہد سے عبارت ہے۔ جو میر تقی میر کے ہاں ہر طرف پھیلے ہوئے تصنع اور ریاکاری سے نفرت ہی نہیں بلکہ ان اعلیٰ عصری اقدار کے ساتھ وفاداری سے ترتیب پاتا ہے جو رفتہ رفتہ ناپید ہوتی جا رہی تھیں۔ دوسرے رویے کا مظہر میر درد اور ان کی شاعری ہے جو تصوف میں پناہ ڈھونڈتے ہیں جو گریز کے ساتھ ساتھ زمانے کے فکر و فن اور شر کی قوتوں کے خلاف مصلحت ناشناسی ہی کی ایک صورت ہے۔ تیسرے سودا اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعے زوال کے شکار اداروں اور شخصیات کا مضحکہ اڑا کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں اور چوتھا رویہ گریز کی کمزور ترین صورت میں جمود کے شکار معاشرے کے ساتھ سمجھوتے یا اسکے جبر کے آگے گھٹنے ٹیک دینے سے عبارت ہے جو انسان کو حقیقت سے روگردانی کرتے ہوئے خواب و خیال کی دنیا میں ہجرت کر جانے کا سبق دیتا ہے۔ ایسے رجحان میں ادب کو عام طور پر تفنن طبع کا ذریعہ سمجھ لیا جاتا ہے تاکہ وہ حالات کے تقاضوں سے انسان کو غافل کر دے اور افیون کی طرح وقتی طور پر سکون مہیا کرے۔ اسی وجہ سے نثر میں طویل دیو مالائی داستانیں تخلیق ہونے لگیں جن میں زبان و بیان کی مہارت کا مظاہرہ کیا جاتا۔ محاورے کی چاشنی اور مقفٰے و مسجع عبارات سے اسے رنگین اور دلچسپ بنایا جاتا تاکہ قاری یا سامع کی توجہ کھینچ سکے اور اس کا انہماک ختم نہ ہونے پائے۔ اسی لئے کہانی میں تجسس برقرار رکھنے کے لئے کسی نازک موڑ پر کہانی کو ختم کر دیا جاتا تاکہ اگلے روز تک پھر کیا ہوا؟ کی سی کیفیت برقرار رہے۔ ساتواں در نہ کھولنے کی تلقین ' چوتھے کھونٹ نہ جانے ' پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی نصیحت ' تجسس بڑھانے کے لئے داستان گو کا مخصوص طریقہ واردات تھا۔

بعض قصوں میں تو قصہ گو اور سامع دونوں افیون کی چٹکی لے کر داستان کا آغاز کرتے ہیں۔ چنانچہ اس دور میں جہاں نثر میں طوطا کہانی ' قصہ چہار درویش اور طلسم ہوش ربا جیسی داستانیں لکھی گئیں وہاں شاعری میں بھی مثنوی کی صنف میں اسی قسم کی داستانوں پر طبع آزمائی کی کوششیں ہوئیں۔ ایسی کہانیوں میں رعیت کو خوش حال اور خزانوں کو مالا مال بتایا جاتا۔ عدل کا اس قدر چرچا ہوتا کہ جنگل میدان میں سونا اچھالتے جایئے کوئی نہیں پوچھے گا کہ آپ کے منہ میں کے دانت ہیں۔ لیکن باہر کا یہ حال ہے کہ شہر میں شیریں فولاد خان کوتوال کی سرپرستی میں ڈاکہ زنی ہو رہی ہے۔ کہیں بنارس کے ٹھگوں نے غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے اور ان کی رہزنی کے ڈر سے مسافر سفر پر نکلتے گھبراتے ہیں۔ کہیں افغان دن دھاڑے دیہاتوں اور شہروں پر دھاوے بول رہے ہیں۔ روہیلوں نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال کر مغلوں کی برائے نام عزت کو بھی خاک میں ملا دیا ہے اور وارن ہیسٹنگز نوابان اودھ کی بیگمات کی جامہ تلاشی میں مصروف ہے۔

زوال اور انحطاط کے جال میں آنے والے شہروں ' تہذیبوں اور ریاستوں کے لوگ انفرادی طور پر ہی نہیں اجتماعی طور پر بھی بے حسی کا شکار ہو کر نصب العین سے عاری ہو جاتے ہیں جو کسی بھی معاشرے کو متحرک رکھنے کی شرط اول ہے۔ ان کی حیات آرزو سے خالی ہو جاتی ہے۔ ریاستی اور معاشرتی ادارے اسی طرح اپنے فرائض سے غافل ہو کر بدعنوانی کے عادی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ادھر محبت کے جذبے کی تہذیب کے لئے کوئی واضح راستہ موجود نہیں ہوتا اور زندگی کے روحانی مطالبوں سے غفلت جنم لیتی ہے ' جس کے نتیجے میں جسم کی سطح پر زندگی گزارنے کا رجحان فروغ پاتا ہے اور حد سے گزر کر طوائف بازی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ مے نوشی سے دن رات اک گونہ بے خودی میں مبتلا رہنا زندگی کا مطمع نظر ٹھہرتا ہے۔

شراب و کباب و بہار و نگار
جوانی و مستی و بوس و کنار

مثنوی سحرالبیان کے اس شعر کی طرح اس کی کہانی بھی اس دور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے انہی منفی تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس کا آغاز بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کوئی بادشاہ تھا جو بہت حشمت و جاہ و مال و منال والا تھا۔ کئی بادشاہ اسے باج دیتے تھے اور اس کے طویلے کے ادنیٰ گدھوں کو بھی نعل بندی میں زر ملتا تھا۔ رعیت آسودہ حال و بے خطر تھی لیکن دنیا کی تمام نعمتیں ہونے کے باوجود اسے ایک غم تھا اور وہ تھا اولاد نرینہ سے محرومی کا غم، آخر اسی رنج میں اس نے ترک دنیا کا ارادہ کر لیا۔ وزیر باتدبیر نے اسے روکا اور نجومیوں اور رمالوں کو دربار میں طلب کر لیا۔ انہوں نے آپس کے مشورے کے بعد یہ پیش گوئی کی کہ بادشاہ کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہو گا لیکن بارہ برس تک اسے بلندی سے خطرہ رہے گا اس لئے اس کی بہت دیکھ بھال کرنا ہو گی۔ پیش گوئی کے مطابق بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام بے نظیر رکھا گیا۔ حفاظت کے خیال سے اسے بارہ برس تک محل میں رکھا گیا اور اسے ہر طرح کی تعلیم و تربیت دی گئی۔ لیکن اتفاق سے جس رات اس نے چھت پر سونے کی خواہش ظاہر کی اور اسے بارہ سال پورے ہونے کی خوشی میں چھت پر سونے دیا گیا وہ اس کے بارہویں سال کی آخری رات تھی۔ اس کے سو جانے پر پہریدار بھی غافل ہو گئے۔ ایک پری اس رات وہاں سے گزر رہی تھی اس نے شہزادے کو دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو گئی اور اپنے ساتھ اٹھا کر پرستان لے گئی۔ ادھر اس کے ماں باپ کا غم سے برا حال تھا ادھر یہ ان سے بچھڑ کر اداس رہتا تھا۔ پری نے اس کا جی بہلانے کے لئے اسے کل کا ایک گھوڑا دیا تاکہ وہ اس پر سوار ہو کر دنیا کی سیر کر لیا کرے۔ ایک دن سیر کے دوران وہ ایک باغ میں اترا جہاں شہزادی بدر منیر بھی اپنی ہم جولیوں کے ہمراہ سیر کرنے آنکلی تھی۔ بے نظیر انہیں دیکھ کر درختوں میں چھپ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہلی نظر میں ایک دوسرے پر یوں عاشق ہوئے کہ فرط شوق میں ان کے ہوش جاتے رہے۔ دختر وزیر نجم النساء نے عطر گلاب چھڑکا جس سے دونوں ہوش میں آئے دونوں نے باہم اظہار محبت کیا اور وصل سے ہمکنار ہوئے۔ اگلی رات وہ پھر ملے لیکن پری ماہ رخ کو خبر ہو گئی اس نے رقابت میں آکر شہزادے کو اندھے کنوئیں میں قید کر دیا۔ ہجر میں بدر منیر کا برا حال تھا اسے خواب میں بے نظیر کی قید کے بارے میں علم ہو گیا۔ نجم النساء جوگن بن کر شہزادے کو قید سے چھڑانے نکلی تو ایک پری زاد فیروز شاہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا اور اپنے ساتھ اٹھا کر اپنے ملک لے گیا۔ نجم النساء نے اس شرط پر اس سے شادی پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ بے نظیر کو مہ رخ کی قید سے چھڑائے گا۔ فیروز شاہ نے مہ رخ کو ڈرا دھمکا کر بے نظیر کو آزاد کروا لیا۔ دونوں بدر منیر کے پاس آئے۔ بے نظیر نے بدر منیر کے باپ سے شادی پر رضامند ہونے یا جنگ کے لئے تیار ہونے کے لئے کہا۔ بدر منیر کا باپ مسعود شاہ شادی پر رضامند ہو گیا اور شادی کے بعد فیروز شاہ اور نجم النساء رخصت ہوئے اور بدر منیر بے نظیر کے ساتھ امن و چین کی زندگی بسر کرنے لگی۔

اس کہانی کے مطابق حقیقت سے آنکھیں چرانے کی ایک مثال اولاد سے محرومی کا بیان ہے۔ موروثی بادشاہت کے بل پر استوار معاشرے میں ولی عہد سے محرومی یقیناً بہت بڑا مسئلہ ہے اس لئے کہ اس کی غیر موجودگی میں انتقال اقتدار کا عمل پیچیدگیوں کا شکار ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جب میر حسن نے ہوش سنبھالا لوگوں کو اولاد کی کمی نہ تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ بادشاہ وقت کی اولاد زیادہ تر طوائفوں اور لونڈیوں کے بطنوں سے ہوا کرتی تھی، جو عام طور پر شاہانہ خصائل سے بے بہرہ اور ناکارہ رہتی تھی۔ خضر خان جیسے خواجہ سرا طوائفوں کے دلال ہونے کے ناطے بادشاہ کے مشیر اعلیٰ تھے۔ شجاع الدولہ کی اگرچہ صرف ایک بیگم تھی لیکن اس کے حرم میں لاتعداد لونڈیاں تھیں اور ان لونڈیوں کے بطن سے بیس لڑکے اور شاید اسی قدر لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ غیر منکوحہ لونڈیوں کی اولاد اپنے خادموں سمیت خوردہ محل میں رہتی تھی اور ان کی تعداد سو کے قریب تھی۔

قصے کے مافوق الفطرت عناصر اس پر مستزاد ہیں، دیو، پریوں اور کل کے گھوڑے کا ہماری حقیقی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں لیکن اس غیر حقیقی، غیر ذہنی اور غیر استدلالی کہانی میں سے بھی لکھنؤ کا معاشرہ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر موضوع اپنے گرد و پیش سے جنم لیتا ہے اور کسی بھی نوعیت کا تخلیقی عمل خواہ وہ حقیقت پسندانہ ہو یا تخیلاتی بہت حد تک خارج کی پیداوار ہوتا ہے۔ ماورائی تصورات بھی دراصل مادی دنیا ہی کا پرتو ہوا کرتے ہیں۔ ماورائیت، عبارت آرائی، تصنع، قافیہ پیمائی اور رنگین سے رنگین تر موضوعات کی تلاش دراصل درباری روایت سے پھوٹنے والی شاعری اور شاعروں کی مجبوری بن جاتی ہے تاکہ ان کے فن اور صناعی پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے جس کے سہارے ان کا دال دلیہ چلتا ہے۔ شہنشاہ خود ایسے غیر عملی افکار کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو عوام کو الہیاتی اور ماورائی دنیا کے سحر انگیز تصورات میں الجھائے رکھیں تاکہ انہیں اپنے استحصال کا شعور حاصل نہ ہونے پائے۔ مافوق الفطرت عناصر معاشرے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹھہراؤ اور سہل پسندی کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں ۔ اس لئے کہ جب انسان اپنے زور بازو سے کوئی کارنامہ سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتا تو پھر وہ نصب العین کے حصول کے لئے درمیانی راستوں (Short Cuts) کی تلاش میں رہتا ہے ۔ عملی دنیا میں یہ درمیانے راستے سفارش ' دھونس اور دھاندلی کی صورت اختیار کرتے ہیں ۔ جب کہ خیالات کی دنیا میں کل کا گھوڑا ' رحم دل جن یا اللہ دین کا چراغ اس کی ایسی نفسیاتی ضرورتوں کی تسکین کرتے ہیں جن کی مدد سے خیال ہی خیال میں اس کے مسائل چٹکی بجانے میں حل ہو جاتے ہیں ۔

جمود کے اسی جبر کے تحت مثنوی سحرالبیان کا شاعر ہمیں ایسی کہانی سنانے پر مجبور ہے جو معاشرے کے کھوکھلے اور فرسودہ اداروں کی ظاہری شان و شوکت اور دبدبے کو بچائے رکھے اور اس کی فرسودگی کو آشکار نہ ہونے دے ۔

جاگیرداری عہد میں جس طرح ذرائع پیداوار پر اونچے طبقہ کی اجارہ داری ہوتی ہے اسی طرح عورت پر بھی سب سے پہلا حق اسی کا ہوتا ہے ۔ چنانچہ عورت سے عشق اور اس سے حظ اٹھانے کا شہزادے کو خصوصی اختیار حاصل ہوتا ہے ۔ یوں بھی زوال کے عہد میں اسے تیر اندازی ' شہ سواری اور جنگ و جدل جیسے مردانہ کاموں سے رغبت نہیں رہتی ۔ عورتوں کی صحبت میں رہتے رہتے اسے مردانہ زبان کا محاورہ نہیں رہتا اور محل میں سانپ گھس آنے پر اس کے منہ سے واجد علی شاہ اختر کی طرح بے ساختہ " مردوئے کو مدد کی خاطر بلانے " کے لئے پکار نکلتی ہے ۔ معاشرے کی جانب سے فراہم کردہ تحفظات اور مراعات کے باعث عشق میں اس کی ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب کہ عام معاشرے کے کسی نوجوان کے لئے اپنی محبوبہ کی محض ایک جھلک دیکھنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا اور وہ اپنی محبت کے المیہ انجام کے لئے ذہنی طور پر پہلے سے تیار ہوتا ہے ۔

شہزادوں کے تصور عشق کے عین مطابق اس مثنوی میں بھی محبت کا تصور پاک نہیں ہے اور انگریزی زبان کے محاورے Love Making سے ملتا ہے ۔ کہانی کا ہیرو بے نظیر ہر موڑ پر ہمیں جنسی اختلاط میں مصروف نظر آتا ہے ۔ وہ شہزادی بدر منیر سے اپنے عشق میں ثابت قدم اسی لئے رہتا ہے کہ وہ اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا باپ مسعود شاہ شادی پر اسی لئے رضامند ہوتا ہے کہ اس سے اسے سیاسی مفادات حاصل ہو سکتے ہیں اور کہانی کا انجام منطقی طور پر طربیہ رہتا ہے ۔

کہانی میں دیو اور پریوں کے کردار بھی دراصل انسانوں کے بعض مثالی نمونوں کو پیش کرتے ہیں ۔ دیو آپ ایسا مرد سمجھ لیں جو مردانگی اور قوت کے اعتبار سے دوسرے مردوں سے برتر ہے ۔ اسی طرح پری وہ عورت ہے جو عام عورتوں اور خوبصورتی کے عام معیاروں سے زیادہ حسین و جمیل ہے ۔ اس لحاظ سے ان کے کردار اور ان سے وابستہ محیرالعقول کارنامے انسانی زندگی سے الگ نہیں کئے جا سکتے کیونکہ ہر انسان اگرچہ ایسا نہیں ہوتا لیکن ایسا بن جانے کی خواہش اس کے دل کے کسی گوشے میں ضرور انگڑائیاں لیتی ہے ۔ دوسرے یہ کہ اس دور کے انسان شاید ان پری زادوں اور پریوں کے وجود پر ہمارے آج کے جمہوری معاشرے کے انسان کے مقابلے میں زیادہ یقین رکھتے تھے ۔ سحرالبیان کی پری مہ رخ اور پری زاد فیروز شاہ کے نام ہی عام انسانوں جیسے نہیں بلکہ جذبات بھی عام انسانوں جیسے ہیں ۔ وہ بھی عشق کی آگ میں جلتے ہیں ۔ چند ایک خصوصیات کے علاوہ جو انسانوں کے گروہ سے انہیں الگ کرتی ہیں ان کی زندگی کے عام معمولات ' رسم و رواج اور بول چال عام انسانوں جیسی ہے اور انہیں بھی اپنے معاشرے میں انہی سماجی قیود اور حد بندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن سے عام انسان دو چار ہوتے ہیں ۔ مہ رخ کو بھی اسی طرح اپنے عشق کے راز اور عاشق کو اپنے باپ سے چھپانا پڑتا ہے جس طرح بدر منیر دنیا سے خوف کھاتی ہے ۔ پری زاد فیروز شاہ بھی نجم النساء کے عشق میں اسی طرح مبتلا ہوتا ہے جس طرح بے نظیر بدر منیر کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے ۔

دربار سے منسلک شاعر کو عام زندگی میں ذاتی مسائل سے یقیناً واسطہ پڑتا ہے اور وہ ان مسائل کے ذمہ دار طبقے سے بھی آشنا ہوتا ہے لیکن ایسے نظام معاشرت کی غلامی اور جبر اسے اس نظام کی خرابیاں اجاگر کرنے کی اجازت نہیں دیتے جس کا وہ خود بھی ایک ادنیٰ کل پرزہ ہے ۔ اسے دربار اور اس کے طبقے میں جود و سخا ' شان و شوکت اور جاہ و جلال کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا اور اگر نظر آتا بھی ہو تو وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا ۔ مثنوی سحرالبیان میں اسی نسبت سے لکھنؤ کے معاشرتی ڈھانچے کے محض اسی ایک خوروبینی حصے کی عکاسی ہوئی ہے ' جو امراء کے طبقے پر مشتمل ہے ۔ لہٰذا اس تمدن کے زیریں طبقوں میں موجود بے چینی کی عکاسی کے برعکس اس مثنوی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عشق و عاشقی ، رقص و سرود ، خواصوں کی رنگ رلیاں اور چہلیں ، شادی بیاہ کی دھوم دھام ، شکار کے جلوس ، ولادت کی رسوم ، حمام میں نہانے کی کیفیت ، محلوں کی آرائش ، دوستوں کی رونقیں ، شاہانہ ملبوسات ، خواب گاہوں کے نقشے بہت کچھ درباری تمدن کا چربہ ہے اور یہ سارا تصنع وہی ہے جو حالی کے خیال میں مسلمانوں کے آخری دور کے سلاطین کی زندگیوں پر حاوی ہو گیا تھا اور اقبال اسے طاؤس و رباب آخر کہتے ہیں ۔ مگر بیشتر ناقدین اسے اس اعتبار سے محمد شاہی اور شاہان اودھ کے درباروں اور اس عہد کے اونچے تمدن و معاشرت کا مرقع سمجھتے ہیں ۔

میر حسن جب شہزادے کی ولادت کا حال بیان کرتے ہوئے جشن کی تصویر کشی کرتے ہیں تو قاری کو غیر محسوس طور پر سلطنت مغلیہ کے دور زوال میں پہنچا دیتے ہیں ۔ غیر ترقی یافتہ معاشرے کے جاہل افراد ہی نہیں بادشاہ بھی اولاد نرینہ کے لئے منتیں مانتا ہے اور مسجدوں میں دیئے جلاتا ہے اور جب نجومیوں اور جوتشیوں کی پیش گوئی کے مطابق ولی عہد پیدا ہوتا ہے تو سجدہ شکر بجالاتا ہے اور دربار عام منعقد کر کے عام خوشی منانے کا حکم دیتا ہے جو سلطنت کے عوام کے لئے بہت بڑا واقعہ ہے ۔ چاروں طرف شادیانے بجنے لگتے ہیں ، نقار خانے میں نوبت بجائی جاتی ہے تاکہ خاص و عام سن کر شاد کام ہوں ۔

بجے شادیانے جو واں اس گھڑی
ہوئی گرد و پیش آ کے خلقت کھڑی
بہم مل کے بیٹھے جو شہنا نواز
بنا منہ پہ پھرکی لگا اس پہ ساز
لگے لینے اوپچیں خوشی سے نئی
ارونا لگا بجنے اور سگھڑئی

امیر و وزیر اس خوشی کے موقع پر بحضور شاہ نذریں گزارتے ہیں کیونکہ نظام ملوکیت میں اختیار اور جاگیر کے مستحق وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں شاہ کی خوشنودی حاصل ہو ۔ شاہ کے خاص الخاص مصاحبین کو دربار داری کے طفیل ہی بیش قیمت جاگیریں اور منصب عطا ہوتے ہیں اس لئے جاگیر کے خواہش مندوں اور جاہ و منصب کے طلب گاروں کے لئے شہزادے کی ولادت سے زیادہ بہتر اور کون سا موقع دستیاب ہو سکتا ہے ۔ چنانچہ حسب واقعات ۔

دیئے شاہ نے شاہزادے کے ناؤں
مشائخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر لشکر کو زر
وزیروں کو الماس و لعل و گہر
خواصوں کو خوجوں کو جوڑے دیئے
پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیئے

غرض جس کے پاس جو نہیں تھا اسے عطا کیا ۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوئیں ۔ چھٹی اور بسم اللہ کی رسم دھوم دھام سے منائی گئی ۔ شاہی سواری کی شان و شوکت دیکھنے کے قابل تھی سارا شہر آئینہ بند ہوا ۔ سواری کے آگے نقیب اور چوبدار ئے بے اہتمام سونے روپے کے کاسے لے کر چلے ۔ سواروں ، پیادوں اور فیلوں کی قطاریں بندھ گئیں ۔ آہستہ گھوڑوں پر لباس زری میں ملبوس نقارچی قدم بہ قدم راستہ بناتے ۔ ہر کسی نے جلوس میں حسب مرتبہ مقام پایا ۔

میر حسن نے اس قدر سلاست اور روانی سے لکھا جو کہانی کا بھی بنیادی تقاضا تھا اور حقیقت نگاری کا بھی ۔ جذبات کی عکاسی پر دسترس بھی میر حسن نے اپنے اسی اسلوب سے بہم پہنچائی ہے ۔ انسانی ہمدردی کا ایک ایسا اعلیٰ تصور اس مثنوی کی واقعیت اور جذباتیت میں جاری و ساری ہے کہ جس سے مافوق الفطرت عناصر پس منظر میں چلے گئے ہیں ۔ اس کے کرداروں کا رویہ از حد پر خلوص ہے اور اسی خلوص نے نجم النساء کے کردار کو اہم بنایا ہے جو کہانی کو کہیں رکنے نہیں دیتا اور جب ایک دفعہ حالات کی زمام اس کے ہاتھ میں آتی ہے تو پوری کہانی اس کی محتاج ہو کر رہ جاتی ہے ۔ وہ جوش سے زیادہ ہوش اور جذبات سے زیادہ عقل سے کام لیتی ہے اور اپنے تدبر سے سہل پسند شہزادی اور شہزادے کی مشکلات آسان کرتی ہے ۔ وہ اپنے عشق میں کامیابی کو بے نظیر اور بدر منیر کے ملاپ کے ساتھ مشروط کر دیتی ہے ۔ یہ بات اس کے جذبہ خلوص کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کے حوالے سے اور بھی معنی خیز بن جاتی ہے جب ہم اس بات کی طرف دھیان دیتے ہیں کہ جس طرح اس دور کی کہانیوں میں بادشاہ کے لئے وزیر کا با تدبیر ہونا ضروری ہوتا ہے اسی طرح شہزادی کے لئے وزیر زادی کا با تدبیر ہونا بھی ضروری ٹھہرتا ہے اور قربانی کی توقعات بھی اسی سے وابستہ کی جاتی ہیں ۔ کرداروں کے حوالے ہی سے میر حسن نے رنج و الم ، حسرت و یاس ، مسرت و انبساط اور ہجر و فراق کے مضامین کو بہت خوبی سے باندھا ہے ، مثلاً رخصت کے منظر میں میر حسن نے اپنے قلم کی تاثیر سے صداقت کے پہلو کو اس طرح اجاگر کیا ہے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بیٹھے تھے خوش ہو کے باہم ادھر
کہ اتنے میں اودھر سے باجا پہر
پہر کے وہ بجتے اٹھا بے نظیر
ہوئی غم کی تصویر بدر منیر
نہ بولی ' نہ کی بات ' نے کچھ کہا
نہ دیکھا اودھر آنکھ اپنی اٹھا
کہا مجھ سے پیاری نہ بیزار ہو
پھر آؤں گا ' بولی کہ مختار ہو

ہجر و فراق کے مضمون کو بیان کرتے ہوئے میر حسن نے جزئیات کی طرف خصوصی توجہ صرف کی ہے۔

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی
یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی
جو پوچھا کسی نے کہ کیا حال ہے
تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے

جذبات کی دنیا میں ماں کی مامتا سے بڑی سچائی اور کوئی نہیں ہے ' یہ وہ رشتہ ہے جہاں غریب امیر ایک ہو جاتے ہیں اور طبقاتی تفریق پیچھے رہ جاتی ہے۔ بیٹے کی گمشدگی پر ماں کی بے قراری کے اظہار میں اپنے کمال فن کو اتنی شدت سے بروئے کار لانا میر حسن ہی کا کام ہے۔

کلیجہ پکڑ ماں تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے بکس رہ گئی
گئیں لے وہ شہ کو لب بام پر
دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیمبر
یہی تھی جگہ وہ جہاں سے گیا
کہا ہائے بیٹا تو یاں سے گیا
شب آدھی وہ جس طرح سوتے کٹی
رہی تھی جو باقی وہ روتے کٹی
عجب طرح کی شب تھی ہیہات وہ
قیامت کا دن تھا نہ تھی رات وہ
سحر نے کیا جب گریبان چاک
اڑانے لگے ملکے سب سر پہ خاک

محبت میں فنا کی حد تک انجذاب اور وفور شوق نجم النساء اور پری زاد کے مابین اس طرح سے مصور ہوتا ہے۔

وہ جوگن جو تھی درد و غم کی اسیر
ہوئی غم میں جوگن کے یہ بھی فقیر
نہ سدھ گھر کی لی اور نہ لی راہ کی
جب آئی ذرا سدھ تو پھر آہ کی
بجاتی رہی بین وہ صبح تک
یہ رویا کیا سامنے بے دھڑک
دھری اپنے کاندھے پہ جب اس نے بین
اٹھی لے کے انگڑائی زہرہ جبین
پری زاد نے تب پکڑ اس کا ہاتھ
شتابی بٹھا تخت پر اپنے ساتھ
زمیں سے اڑا آسماں کے تئیں
وہ کتنا کہا کی ' نہیں رے نہیں

یہ وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر فن ' محمود فاروقی کی رائے میں کبھی سے بڑھ کر دہی ہو جاتا ہے اور اس کا اثر چکبست کے مطابق بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے۔

میر حسن سراپا نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے اور انہوں نے مغلوں کے عہد زوال میں ہندوستانی شہزادے ' شہزادیوں اور امراء کی بہت عمدہ شبیہیں پیش کی ہیں۔ ایک مکتبہ فکر مسلمان شعراء کی مثنویوں میں سراپا نگاری کے اعتدال کی حدوں سے نکلتے ہوئے رجحان کو ہندوستان کے بت پرستانہ مذاہب کی دین سمجھتا ہے۔ اس لحاظ سے مثنوی سحر البیان مذہبی معاشرے کی بھی عکاس ہے اور اگر اس پر مزید تحقیق کی جائے تو ہندی موسیقی کے راگوں ' نجم النساء کے جوگ اور رمالوں کی پیش گوئیوں کے طریقوں کے علاوہ اور بھی ایسی مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں جہاں ہندو اور مسلمان تہذیبیں معانقہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتی نظر آتی ہیں اور ابھی علیحدہ مسلم قومیت شاید اپنے ارتقاء کے ابتدائی مراحل میں داخل ہوا چاہتی ہے۔

کوئی شعر اس لئے زبان زد عام ہوتا ہے کہ اس میں بظاہر بہت معمولی مگر بہت نازک اور بنیادی حقیقت سادہ اور دلنشیں پیرائے میں بیان ہوئی ہو اور اپنی طرز اظہار سے ایک مشترک تجربہ بن جائے جسے ہر کوئی Share کرسکے۔

سحرالبیان کے بھی بعض اشعار زمان و مکان کی حدوں سے نکل کر لافانی ہو گئے ہیں۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں
کٹی رات حرف و حکایات میں
سحر ہو گئی بات ہی بات میں
کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
لبوں سے ملے لب ' دہن سے دہن
دلوں سے ملے دل ' بدن سے بدن

شائد یہی وہ خوبیاں ہیں جن کے باعث مولانا محمد حسین آزاد کہنے پر مجبور ہوئے کہ میر حسن نے لکھا اور ایسی صاف زبان ' فصیح محاورے اور میٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت سے ادا کیا جیسے آب رواں اصل واقعے کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ گیا اور ان ہی باتوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں جو اس وقت وہاں ہو رہی تھیں۔ اس نے خواص اہل سخن کی تعریف پر قناعت نہ کی بلکہ عوام بھی ' جو حروف تہجی تک نہیں پہچانتے تھے وظیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے۔ لوگوں کی زبانوں پر اس مثنوی کے چڑھ جانے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ لوگ زوال کے عہد میں بھی رہنمائی کے لئے ابھی تک انہی اداروں کی طرف دیکھتے تھے جن کا ذکر اس مثنوی میں ہوا ہے۔ دوسری وجہ ہمارے ہاں صدیوں سے پائی جانے والی اسلاف پرستی اور نفسیاتی ضرورت کے تحت درخشندہ ماضی کی طرف دیکھنے کی عادت ہے جب ہر طرف امن و چین اور خوشحالی کا فی الحقیقت دور دورہ تھا اور تیسری وجہ حقائق کی تلخی سے گریز کرتے ہوئے خارجی عوامل سے پیدا ہونے والے اعصابی تناؤ کو کم کرنے کے لئے خواب و خیال کی دنیا میں ہجرت کا رجحان ہے۔ بہرحال اتنی بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ہم اس مثنوی سے عہد زوال کے عام معاشرے کی بالواسطہ طور پر اور درباری معاشرے کی بلاواسطہ طور پر تفہیم کا کام لے سکتے ہیں اہل علم و ادب اس بات پر متفق ہیں کہ شعر ' افسانہ اور ناول تہذیبی ارتقاء کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور وہ بالواسطہ طور پر تاریخ کی کروٹوں ' نشیب و فراز اور عروج و زوال کو منعکس کرتے ہیں۔

لیکن شعر ' افسانہ یا ناول کو محض تاریخ نہیں سمجھا جاسکتا۔ تخلیقی تجربہ معنی آفریں علامتوں ' تشبیہوں اور استعاروں کی وساطت سے اس طرح صورت پذیر ہوتا ہے کہ مثنوی سحرالبیان جیسے فن پارے صرف اپنے عہد میں ہی نہیں ' آنے والے دنوں میں بھی سماجی اتار چڑھاؤ اور اداروں کے کردار کی تفسیر و تفہیم کے لئے کار آمد رہتے ہیں۔

میر حسن جیسے شاعروں کا مقصد ایسی تخلیقات سے یہ ہوتا ہے کہ سماجی عمل جمود کا شکار نہ ہو اور معاشرہ ان کے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی اصلاح کرتا رہے۔ زیر نظر مثنوی اس اعتبار سے اس زمانے میں اور بھی معنی خیز ہے کہ زوال کا وہ عمل جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے بعد طوائف الملوکی کے باعث مسلمانوں کی انگریزوں کے ہاتھوں پے در پے شکستوں اور بتدریج غلامی سے شروع ہوا تھا وہ ابھی تک جاری ہے۔ اگرچہ درمیان میں بیشتر انفرادی اور کم اجتماعی کوششوں سے اس کی رفتار میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔

پاکستان کی آزادی پر منتج ہونے والی تحریک پاکستان کے نتائج پر معروضی نگاہ ڈالیں' تو اس کا مختصر وقفہ زوال کے طویل اندھیرے میں ذرا سی دیر کے لئے چمک جانے والی روشنی کی ایک تیز لکیر سے زیادہ نہیں ہے۔ اس مثنوی میں جن اداروں کی تصویر کشی ہوئی ہے ان کے صرف عنوانات اور نام تبدیل ہوئے ہیں جبکہ اعمال و افعال ' جھوٹی شان و شوکت ' دکھاوے اور تصنع میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اسی طرح انتقال اقتدار کی پیچیدگیاں بھی اسی طرح قائم ہیں اگرچہ ان کی نوعیت قدرے تبدیل ہو گئی ہے۔ معاشرے کی اقدار بھی ویسی ہی متحجر اور روایات اسی قدر شکستہ ہیں اور تازہ کاری کو ترس رہی ہیں۔

ان فرسودہ اداروں کی مزاحمت اس قدر طول پکڑ جائے گی ' اس کا اندازہ اس دور کے شاعر کو شاید نہیں ہوا تھا لیکن اسی وجہ سے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مثنوی میں ہمیں ماضی و حال کا تال میل نظر آ رہا ہے۔

مثنوی میر حسن کے زمانہ تخلیق اور پیش نظر حالات و واقعات کے پس منظر کے مطالعے سے ایک اور پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ جس طرح ماضی قریب تک شعراء وقائع نگار اور داستان گو دربار سے وابستہ ہوا کرتے تھے، اسی طرح آج کے عہد کے لکھنے والوں کی ایک معقول تعداد ایوان حکومت کی وادیوں تک رسائی حاصل کر لیتی ہے اور جس طرح تاریخ میں شعراء اور وقائع نگار اصل حقائق پر پردہ ڈال کر بادشاہ وقت کی عظمت اور جاہ و جلال کے گن گایا کرتے تھے اسی طرح آج کے بیشتر راوی بھی بد امنی اور بربریت سے صرف نظر کرتے ہوئے چین ہی چین لکھتے ہیں اور حکمرانوں کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

تیسری دنیا کے بیشتر ممالک جہاں یک جماعتی یا انفرادی حاکمیتیں قائم ہیں اپنے اپنے معاشروں کی اصلی اور اندوہناک صورت حال کے برعکس "سحر البیان" میں میر حسن جیسی منظر کشی کی جا رہی ہے اور دوسری طرف اداروں کی شکست و ریخت اور زوال کا عمل اسی طرح غیر محسوس طور پر جاری ہے۔

حوالہ جات

۱۔ باری علیگ "کمپنی کی حکومت" ، نیا ادارہ لاہور، چوتھا ایڈیشن ، ۱۹۶۹ء

۲۔ رالف رسل ، خورشید الاسلام مترجم "تھری مغل پوئیٹس" ہارورڈ یونیورسٹی پریس کیمبرج ، ۱۹۶۸ء

۳۔ محمد حسین آزاد "آب حیات" سنگ میل پبلی کیشنز لاہور س۔ن

۴۔ محمود فاروقی "میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعراء" مکتبہ جدید لاہور ، ۱۹۵۶ء

۵۔ میر حسن "مثنوی سحر البیان" مکتبہ شہکار لاہور ، س۔ن

۶۔ ڈاکٹر وحید قریشی "میر حسن اور ان کا زمانہ" اردو بک سٹال لاہور ، ۱۹۵۹ء

۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا "اردو شاعری کا مزاج" مکتبہ عالیہ لاہور ، ۱۹۷۸ء

ادارہ کی مطبوعات

N.A.Baloch, *Fathnamah-i-Sind,* (English & Persian),1983, English 158 & Persian 284 + xii pp. Rs.160/-.

Riaz Ahmad, *Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah: The Formative Years, 1892-1920,* 1986, 254 + xvi pp. Rs.130/-.

Muhammad Hajjan Shaikh, *Maulana Ubaid Allah Sindhi: A Revolutionary Scholar,* 1986, 301 + xiv pp. Rs.100/-.

Agha Hussain Hamadani, *The Frontier Policy of Delhi Sultans,* 1987, 220 + xix pp. Rs.150/-.

M. Yusuf Abbasi, *London Muslim League (1908-1928): A Historical Study,* 1988, 426 + xiii pp. Rs.260/-.

K.K. Aziz, *The British in India: A Study in Imperialism,* 1976,415 + xiv pp.H.B. Rs. 100/-, P.B.Rs. 45/-.

M.Rafique Afzal, *Political Parties in Pakistan: 1947-1958,* Vol.1, 1976, 2nd Ed. 1987, 270 + xvi pp. Rs.90/-, Vol.II, 1958-69, 1987, 216 + xvi pp. Rs. 120/-.

K.K. Aziz, *Party Politics in Pakistan: 1947-1958,* 1976, 302 + xii pp. Rs.65/-.

S. Sharifuddin Pirzada, *Some Aspects of Quaid-i-Azam's Life,* 1978, 90 + x pp. Rs.25/-.

Miss Lal Baha, *N.W.F.P. Administration Under British Rule, 1901-1919,* 1978, 197 + xii pp. Rs.75/-.

© rasailojaraid.com